ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ گیت اور ان کے المیہ گیت نگار: ایک تنقیدی، جمالیاتی اور سماجیاتی مطالعہ

The Tragic Songs of Attaullah Esakhelvi and His Melancholic Lyricists: A Critical, Aesthetic, and Sociological Study

ضیاء الدین خان نیازی

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، مائی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر باقر وسیم

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مائی یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract:

This research paper presents an exhaustive critical, stylistic, and socio-cultural investigation into the tragic and melancholic songs rendered by Pakistan's iconic folk maestro, Attaullah Khan Esakhelvi, alongside an analytical evaluation of his primary lyricists. Emerging prominently during the technological transformation of the late twentieth century, Esakhelvi redefined the aesthetics of subcontinental sorrow by giving authentic voice to subaltern disenfranchisement, rural displacement, and emotional fragmentation. Utilizing textual analysis and qualitative cultural methodologies, this study examines how indigenous poets synthesized the stark topography of the Thal desert with accessible folk idioms. The paper demonstrates that Esakhelvi's tragic oeuvre transcends commercial popular music, operating as a potent site of collective psychological catharsis and socio-poetic resistance against institutional cultural hegemony.

Keywords:

Attaullah Khan Esakhelvi, Tragic Folk Music, Melancholic Lyrics, S. M. Sadiq, Farooq Rokhri, Cassette Culture, Poetics of Pathos.

انسانی تاریخ میں فنِ موسیقی اور شاعری کا باہمی اشتراک ہمیشہ سے باطنی واردات، اجتماعی المیوں اور وجودی کرب کے اظہار کا سب سے مستند ذریعہ رہا ہے۔ انسانی تمدن کے ابتدائی نقوش سے لے کر معاصر عہد کے پیچیدہ سماجی ڈھانچے تک، غم، حزن اور ملال کو انسانی وجود کی سب سے گہری، سچی اور غیر مشروط حقیقت قرار دیا گیا ہے۔ فلسفۂ جمالیات اور مشرقی شعریات کی روایات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ سرور و شادمانی کے مقابلے میں "الم" (Pathos) تخلیقی قوت کو زیادہ گہرائی، تنوع اور دوام بخشتا ہے۔ مشرقی جمالیاتی تناظر بالخصوص برصغیر پاک و ہند کے فکری دھارے میں "رس سدھانت" (Rasa Theory) کے تحت "کرونارس" (حزن و ملال کا تاثر) کو روح کی بالیدگی کا سب سے موثر ذریعہ مانا گیا ہے۔ صوفیانہ روایات میں بھی فراق، ہجر اور باطنی تڑپ کو وصل کی ظاہری آسودگی پر فوقیت حاصل رہی ہے، کیونکہ ہجر ہی وہ آگ ہے جو انسانی انا کو جلا کر کندن بناتی ہے اور اسے کائنات کے ازلی درد سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

جنوبی ایشیا کی سرزمین پر لوک موسیقی اور عوامی شاعری نے صدیوں سے اشرافیائی اور درباری نفاست پسندی کے متوازی عام انسان کے سچے دکھوں، طبقاتی محرومیوں، اور ہجر و فراق کے حقیقی تجربات کو اپنے دامن میں سمیٹے رکھا ہے۔ کلاسیکی موسیقی جہاں محلات، درباروں اور خانقاہوں کی مخصوص فکری و تکنیکی حدود میں پروان چڑھی، وہیں لوک گائیکی کسانوں کے کھیتوں، ملاحوں کی کشتیوں، گڈریوں کی چراگاہوں اور مسافروں کے کاروانوں کی دھول سے پھوٹی۔ لوک موسیقی کی اصل قوت اس کی سادگی، فطری بے ساختگی اور زمینی حقیقتوں کے ساتھ اٹوٹ وابستگی ہے۔ پاکستان کے سماجی و ثقافتی منظرنامے میں بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کے دوران لوک موسیقی کی ایک ایسی لہر نمودار ہوئی جس نے اس المیہ روایت کو ایک نیا، انقلابی اور عوامی آہنگ عطا کیا۔ اس لہر کے سب سے توانا، مستند اور تاریخ ساز نمائندے عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہیں۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی فنی شناخت کا سب سے غالب، موثر اور دیرپا پہلو ان کے گائے ہوئے المیہ گیت ہیں۔ یہ نغمات محض رسمی عشقیہ ناکامی کا روایتی ماتم نہیں ہیں بلکہ ان کی جڑیں پنجاب اور بالخصوص سرائیکی وسیب کے مخصوص جغرافیائی، سماجی اور طبقاتی ڈھانچے میں پیوست ہیں۔ ان نغمات میں تھل کے صحرائی کینوس کی پیاس، سندھ کے

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

کچے کے علاقوں کی بے سروسامانی، محنت کش طبقے کی مسلسل شکست خوردگی اور پردیس کے جان لیوا کرب کو ایک لافانی صوتی پیکر عطا کیا گیا ہے۔ عیسیٰ خیلوی نے روایتی نشریاتی اداروں کے قائم کردہ مخصوص تکنیکی و اشرافیائی معیارات کے برعکس خالص عوامی، دیہی اور غیر تصنع پسند اسلوب کو اپنا کر ایک متوازی ثقافتی تحریک کی بنیاد رکھی۔

المیے کی شعریات اور فلسفیانہ پس منظر کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ المیہ دراصل انسان کی تقدیری بے بسی اور آدرشوں کی شکست کا وہ فنکارانہ بیانیہ ہے جو روح کو پاکیزگی بخشتا ہے۔ یونانی شعریات سے لے کر معاصر ادبی تنقید تک المیہ کو اسی لیے اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے کہ یہ انسان کے باطنی تضادات اور خارجی دنیا کی بے رحمی کو بے نقاب کرتا ہے۔ ارسطو اپنی شہرہ آفاق تصنیف بوطیقا میں المیے کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:

> ”المیہ نقل ہے کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل ہو اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا ہو، جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو جس سے حظ حاصل ہوتا ہو لیکن مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے، جو دردمندی اور دہشت کے ذریعہ اثر کرے، ایسے ہیجانات کی صحت اور اصلاح کرے۔“(۱)

ارسطو کے اس نظریۂ تزکیۂ نفس یعنی کیتھارسس کا اطلاق جب ہم عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی المیہ گائیکی پر کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کے گیت سننے والے کے اندر دبی ہوئی اداسی، خوف اور محرومی کو بیدار کر کے اسے ایک پرسکون جذباتی فضا میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ارسطو نے جس ہمدردی (Pity) اور خوف (Fear) کو المیے کا بنیادی جوہر قرار دیا تھا، وہ عیسیٰ خیلوی کے ہر نغمے میں ایک مادی اور جیتی جاگتی حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں۔ ہمدردی اس المیہ کردار (عاشق / محروم انسان) کے ساتھ جو بے پناہ خلوص کے باوجود زمانے کے ستم سہتا ہے، اور خوف اس تقدیر اور سماجی بے حسی سے جو کسی بھی لمحے کسی بھی انسان کا مقدر بن سکتی ہے۔

اس المیہ فن کی تعمیر میں جہاں عطاء اللہ کی دردمند آواز کا حصہ ہے، وہیں ان کے المیہ گیت نگاروں کا کردار ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایس ایم صادق، فاروق روکھڑی، سید قاسم شاہ، ملک سونا خان بے وس اور دیگر شعرا نے اپنے کلام سے اس المیے کو وہ فکری بنیادیں فراہم کیں جن پر یہ پوری صوتی عمارت کھڑی ہوئی۔ زیر نظر مقالے کا مقصد عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ گیتوں، ان کے صوتی و متنی خصائص اور ان کے گیت نگاروں کے شعری اختصاص کا جامع تنقیدی و تحقیقی محاکمہ پیش کرنا ہے۔

جغرافیائی و سماجیاتی تناظر: تھل، میانوالی اور سرائیکی وسیب کا ماحولیاتی نوحہ

کسی بھی فنکار کی تخلیقی ساخت کو اس کے جغرافیائی اور ثقافتی کینوس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا تعلق میانوالی کے تاریخی قصبے عیسیٰ خیل سے ہے، جو ایک طرف دریائے سندھ کی بپھری ہوئی لہروں اور کچے کے کٹاؤ کا گواہ ہے تو دوسری طرف تھل کے وسیع و عریض ریگزاروں اور کوہستانِ نمک کے سنگلاخ سلسلوں سے جڑا ہوا ہے۔ تھل کی بنجر ریت، گرمیوں کے جان لیوا لو کے تھپیڑے، پانی کی بوند بوند کو ترستے ہوئے پیاسے پودے اور افق تا افق پھیلی ہوئی اداسی اس خطے کے باسیوں کے خمیر میں شامل ہے۔ یہ ماحولیاتی سختی محض ایک مادی حقیقت نہیں بلکہ یہ ایک باقاعدہ داخلی کیفیت (Internal Landscape) میں تبدیل ہو کر یہاں کے لوک ادب اور موسیقی میں جھلکتی ہے۔

سرائیکی وسیب کی روایتی شاعری میں خواجہ غلام فرید، سچل سرمست اور شاہ لطیف کے ہاں جو روہی اور صحرا کی تپش ملتی ہے، وہی پیاس اور بیابان کا احساس عیسیٰ خیلوی کے المیہ گیتوں میں جدید دور کے عوامی دکھوں کے ساتھ ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ تھل کا مسافر جب تنہا ریت کے ٹیلوں پر چلتا ہے تو اس کے پاؤں تلے ریت کی تپش اور سینے کے اندر کی پیاس ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اس خطے میں معاشی محرومی، جاگیردارانہ جبر، روزگار کی عدم دستیابی اور صحت و تعلیم کی ناکافی سہولیات نے صدیوں سے عوام کو ایک مسلسل کشمکش میں مبتلا رکھا ہے۔ جب ایک عام دیہی انسان اپنے وسائل کے لٹ جانے اور خوابوں کے بکھر جانے کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے منہ سے نکلنے والی صدا المیہ نغمے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عطاء اللہ نے میانوالی اور سرائیکی وسیب کی اسی ماحولیاتی اور طبقاتی محرومی کو اپنی آواز کا سرگم بنایا، جس کے باعث ان کے گیتوں میں صرف فرد کا ماتم نہیں بلکہ پوری مٹی کا نوحہ سنائی دیتا ہے۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی فنی و شخصی تشکیل اور المیہ مزاج

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ مزاج کی تفہیم کے لیے ان کے شخصی، جذباتی اور جغرافیائی پس منظر کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔ میانوالی کے قصبے عیسیٰ خیل سے تعلق رکھنے والے اس فنکار کے اندر المیے کا بیج محض کسی خارجی تحریک کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ان کے ذاتی مشاہدات، ناکام محبتوں کے زخموں اور وسیب کی روایتی سختیوں نے ان کے

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

احساس کو بے پناہ حساس بنا دیا تھا۔ عیسیٰ خیلوی کی شخصیت میں عشق ایک مستقل آدرش اور المیہ تجربے کی صورت میں موجود رہا ہے۔ ان کے اس داخلی انتشار، جذباتی بے قراری اور کثرتِ عشق کے المیے کو ان کے قریبی دوست اور استاد پروفیسر منور علی ملک نے نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

پروفیسر منور علی ملک لکھتے ہیں:

> "عطاء کے عشق کی داستان تو ایک فقرے میں سمٹ گئی مگر اس کے معاشقوں کی تفصیل ایک کتاب تو کیا، کئی جلدوں میں بمشکل سمائے گی۔ مختصریوں سمجھ لیجئے کہ عطاء جہاں بھی گیا ایک آدھ فالتو دل جیب میں ڈال کر ہمراہ لے گیا۔ اور حسب ضرورت کسی نہ کسی کو دے کر ہی لوٹا۔" (۲)

یہ فکری و نفسیاتی کیفیت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ عطاء اللہ کے ہاں عشق کوئی سطحی یا وقتی کھیل نہیں تھا بلکہ ایک ایسا جان لیوا روگ تھا جس نے ان کے پورے وجود کو درد کی بھٹی میں جھونک دیا۔ جب انسان ہر موڑ پر دل ہارنے اور بدلے میں زخم کھانے کی مستقل کیفیت سے گزرتا ہے تو اس کے اندر دکھ ایک مستقل عادت اور فنکارانہ مجبوری بن جاتا ہے۔ نفسیاتی اصطلاح میں اسے ایک ایسا رومانوی انتشار کہا جا سکتا ہے جہاں انسان اپنی روح کے خلا کو پر کرنے کے لیے بار بار محبت کی آگ میں کودتا ہے، لیکن ہر بار ناکامی اس کے داخلی المیے کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے نغمات میں جس کرب کو گایا، وہ ان کے اپنے اندر کا ابلتا ہوا لاوا تھا۔

عطاء اللہ کی ابتدائی زندگی کا المیہ صرف ناکام محبت تک محدود نہیں تھا بلکہ سمجھ نہ آنے والے جذباتی تقاضوں اور وقت کے بے رحم گزرنے کا المیہ بھی اس میں شامل تھا، جہاں عمر کا قیمتی سرمایہ دکھوں کی نذر ہو گیا۔ پروفیسر منور علی ملک نے اس کیفیت کی عکاسی کے لیے یہ سرائیکی دوہڑا نقل کیا ہے:

چن میڈے کوں سمجھ نہ آئی، سمجھیندیاں عمراں ڈھل گئی
کچھے دلبر دے میں کملے دی سکھی جندڑی دکھاں وچ گل گئی

(۳)

اس دوہڑے کا تنقیدی تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں عاشق کا المیہ محض محبوب کی دوری نہیں بلکہ اپنے ہی وجود کا مسلسل گھلنا اور زندگی کے مواقع کا ضائع ہو جانا ہے۔ سرائیکی شعری روایت میں "دوہڑا (Dohra)" المیے کے اظہار کا سب سے مقبول، بلیغ اور تیز دھار ہتھیار ہے۔ ڈوہڑے کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے پہلے تین مصرعے جذباتی فضا، تمہید اور واقعاتی پس منظر بناتے ہیں جبکہ چوتھا مصرع بجلی بن کر سامع کے دل پر گرتا ہے۔ اس دوہڑے میں "سمجھیندیاں عمراں ڈھل گئی" (سمجھاتے سمجھاتے عمریں بیت گئیں) اور "جندڑی دکھاں وچ گل گئی" (زندگی دکھوں کی نذر ہو کر پگھل گئی) ایسے الفاظ ہیں جو انسان کی ازلی بے حاصلی، تشنہ کامی اور وقت کے بے رحم بہاؤ کو مجسم کر دیتے ہیں۔ عیسیٰ خیلوی کی گائیکی میں یہی پچھتاوا، یہی نوحہ اور یہی بے حاصلی ایک بنیادی صوتی لہر بن کر ابھرتی ہے، جس نے ان کے المیہ گیتوں کو سطحی تفریح سے الگ کر کے ایک وجودی سچائی میں بدل دیا۔

کیسٹ کلچر کا ظہور، نشریاتی اجارہ داری اور عوامی مقبولیت

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ فن کے تاریخی سفر کو اس وقت تک درست تناظر میں نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ ستر اور اسی کی دہائیوں کے تکنیکی انقلاب اور کیسٹ کلچر کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ اس عہد میں موسیقی کے مرکزی ذرائع یعنی ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن پر ایک خاص شہری اور ادبی اشرافیہ کا تسلط تھا، جو عام لوک فنکاروں کو اپنے سخت اور بعض اوقات غیر حقیقی معیاروں کی بنیاد پر مسترد کر دیا کرتے تھے۔ اس دور میں سرکاری میڈیا کے دروازے ان گلوکاروں کے لیے بند تھے جو کلاسیکی راگوں کے مخصوص تال میل یا لکھنوی و دہلوی اردو کے معیاری لب و لہجے پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اس دور میں عیسیٰ خیلوی اور ان کے ساتھی شدید معاشی تنگی اور وسائل کی کمی کا شکار تھے، لیکن ان کے اندر اپنے فن کو محفوظ کرنے کا ایک جنونی شوق موجود تھا۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

پروفیسر منور علی ملک ان ابتدائی دنوں کی غربت اور کیسٹ ریکارڈنگ کے شوق کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تنگ دستی کے وہ دن۔۔۔۔۔ اس زمانے میں عیسیٰ خیل میں ٹیپ ریکارڈر اکا دکا خوش نصیبوں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ اپنا ٹیپ ریکارڈر خریدنے کی توفیق ہم لوگوں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ تھی۔ مگر ہر رات کی محفل کو ریکارڈ کرنے کا شوق دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔"(۴)

وسائل کی اسی قلت کے باوجود جب آڈیو کیسٹ کا جمہوری میڈیم عام ہوا تو اس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بند دروازوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ معروف برطانوی محقق پیٹر مینوئل (Peter Manuel) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب *Cassette Culture* میں اس بات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے کہ کس طرح آڈیو کیسٹ ٹیکنالوجی نے ترقی پذیر دنیا میں کارپوریٹ اور ریاستی نشریاتی اجارہ داریوں کو پاش پاش کر کے پسے ہوئے طبقات کے لوک فنکاروں کو براہِ راست عوام سے جوڑ دیا۔ پاکستان میں اس "کیسٹ انقلاب" کے سب سے بڑے سرخیل عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی بنے۔ فیصل آباد کے "رحمت گرامو فون ہاؤس" اور دیگر مقامی ریکارڈنگ کمپنیوں نے معمولی معاوضے پر ان کی کیسٹیں تیار کیں، جو جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئیں۔

عیسیٰ خیلوی کی آواز کیسٹوں پر ریکارڈ ہو کر ٹرکوں، بسوں، کھیتوں، اینٹوں کے بھٹوں اور محنت کشوں کے ڈیروں تک پہنچ گئی۔ جس فنکار کو روایتی نشریاتی ادارے قبول کرنے سے انکاری تھے، اس نے عوامی مقبولیت کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے اور اس کی گونج سرحدوں کے پار تک جا پہنچی۔ پاکستان کے دور دراز دیہاتوں سے لے کر مشرقِ وسطیٰ کے صحراؤں میں پسینہ بہانے والے تارکینِ وطن تک، ہر اس شخص کے پاس عطاء اللہ کی کیسٹ موجود تھی جس کا دل کسی اپنے کے فراق میں تڑپ رہا تھا۔

مشفق راٹھور نے نشریاتی اداروں کے اسی استرداد اور عیسیٰ خیلوی کی عالمی فتح کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کون سوچ سکتا تھا کہ پاکستان کے ایک چھوٹے سے علاقے عیسیٰ خیل کا نام پوری دنیا میں صرف عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی بدولت مشہور ہو جائے گا اور جس عوامی فنکار کو پاکستان کے نشریاتی ادارے مسترد کر چکے تھے اس کے کلام اور دھنوں کو گا کر بھارت کے دورِ حاضر کے معروف گلوکار اپنا مقام حاصل کر لیں گے۔"(۵)

یہ تنقیدی نکتہ بے حد اہم ہے کہ عیسیٰ خیلوی کی المیہ گائیکی نے مقامی سطح سے اٹھ کر بین الاقوامی ثقافتی منڈی میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ بھارت کے نامور گلوکاروں بشمول سونو نگم، الطاف راجہ، اور بالی ووڈ کے موسیقاروں نے ان کے المیہ نغمات (جیسے "اچھا صلہ دیا تو نے میرے پیار کا"، "عشق میں ہم تمہیں کیا بتائیں" وغیرہ) کو دوبارہ گا کر اپنی مقبولیت کے محل تعمیر کیے۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت تھا کہ جس خالص عوامی درد کو سرکاری ادارے "غیر معیاری" سمجھ کر مسترد کر رہے تھے، اس میں سرحدوں اور زبانوں کی قید سے آزاد ہو کر دلوں کو فتح کرنے کی بے پناہ مقناطیسی صلاحیت موجود تھی۔

عوامی سطح پر اس بے مثال مقبولیت اور لوک فن کی بے لوث خدمت کے اعتراف کے طور پر بالآخر ریاست کو بھی ان کے مقام کو تسلیم کرنا پڑا۔ جب ایک فنکار کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن جائے تو سرکاری ایوانوں کے لیے اس کی آواز کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہتا۔

مشفق راٹھور اس حوالے سے مزید رقم طراز ہیں:

"لوک گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے جہاں اپنے فن سے پاکستان کا نام پوری دنیا میں روشن کیا وہیں انہوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر حکومت پاکستان سے تمغہ حسن کارکردگی (پرائیڈ آف پرفارمنس) حاصل کیا۔"(۶)

یہ تمام شواہد ثابت کرتے ہیں کہ عطاء اللہ کا المیہ فن کسی سرکاری یا درباری سرپرستی کا محتاج نہیں تھا، بلکہ یہ اس مٹی اور اس کے عام انسانوں کی محبت کا ثمر تھا جس نے بالآخر اشرافیائی اداروں کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کیا۔ یہ فن عوامی سرپرستی کی وہ روشن مثال ہے جس نے ثابت کیا کہ حقیقی کلاسیکیت وہ نہیں جو کتابوں اور ڈرائنگ رومز میں بند رہے، بلکہ وہ ہے جو عوامی حافظے کا لازوال حصہ بن جائے۔

وہ جب گاتے ہیں تو شعر کے المیہ تاثر کو محض سُروں کے تال میل سے نہیں بلکہ اپنے سانس کے زیر و بم اور لفظوں کے اندر چھپی ہوئی چیخ سے سامع پر وارد کرتے ہیں۔ وہ راگ بھیرویں، پہاڑی، پیلو اور دیسی لوک دھنوں کو اس مہارت سے برتتے ہیں کہ راگ کا روایتی ڈھانچہ ایک دم زندہ المیہ تجربے میں بدل جاتا ہے۔ ہارمونیم کے آخری

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

تاروں پر ان کی انگلیوں کی تیز رفتاری، دائیں ہاتھ سے ہارمونیم کے پردوں پر بجلی کی مانند لپکنا، اور ساتھ ہی گلے سے نکلنے والی طویل حزنیہ لہر سامع پر ایک لرزہ خیز کیفیت طاری کر دیتی ہے۔

پروفیسر منور علی ملک نے عیسیٰ خیلوی کی گائیکی کے اس جادوئی اور دلدوز منظر کو اپنے مشاہدے میں اس طرح قید کیا ہے:

"جوگ کے کرب میں تڑپتے ہوئے یہ بول فضا میں بکھر جاتے ہیں:

دو دل ٹٹ گئے لٹ چمن گیا تے ھک کوک معشوق دی آئی
کتھے یار گلیوں میں اُجڑی دا میں پھر دیاں وانگ سودائی

جیویں لالا جیویں، یہ ماسٹر وزیر کی مخصوص داد تھی۔ اس کے ساتھ ہی لالا کی انگلیاں بجلی کی سی سرعت سے ہارمونیم کے آخری سروں تک جا پہنچتی ہیں اور ڈوھڑے کے یہی بول ایک دردناک چیخ بن کر درودیوار پر بھی رقت طاری کر دیتے ہیں۔ پہلے مصرعہ میں 'گئے' کے لفظ پر پہنچ کر یہ چیخ اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ایک انجانے خوف سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور جب مصرعہ ختم ہوتا ہے تو ہم بے اختیار پکار اٹھتے ہیں جیو لالا۔"(۷)

اس اقتباس کا فنی اور جمالیاتی تجزیہ واضح کرتا ہے کہ عطاء اللہ کے ہاں المیہ گائیکی محض ایک تفریحی عمل نہیں ہے بلکہ ایک باقاعدہ صوتیاتی کشمکش ہے جس میں گانے والا خود اپنے دکھ کے آخری سرے تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کا گلا جب کسی لفظ پر رک کر لمبی تان لیتا ہے تو وہ تان ایک انجانے خوف، ہجر کی شدت اور فنا کے احساس کو مجسم کر دیتی ہے۔ ماسٹر وزیر (مرحوم) کے ایکارڈین اور بینجو کی دھنیں، اور ساتھ عطاء اللہ کی ہارمونیم پر برق رفتاری محفل کے اندر ایک ایسا سحر طاری کر دیتی تھی جہاں وقت تھم جاتا تھا اور سننے والے اپنے تمام ترخارجی وجود کو بھول کر دکھ کی لہر میں ڈوب جاتے تھے۔

یہ نغمگی دراصل فنکار کے سینے کے اندر سلگتے ہوئے اس زخم کا اظہار ہے جسے وہ لفظوں اور راگوں کے لبادے میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ عطاء اللہ کا فن محض رسمی گائیکی نہیں بلکہ ان کے اپنے لہو کا نذرانہ ہے۔ فنکار جب اپنے نجی کرب کو فن کا حصہ بناتا ہے تو وہ تخلیقی سطح پر خود کو جلا رہا ہوتا ہے۔ اس المیہ فنی شعور کا اعتراف پروفیسر منور علی ملک کی مرتب کردہ کتاب میں ان اشعار کی صورت میں ملتا ہے:

درد بھری چیخ ہوں نا کام دعا ہوں اجڑے ہوئے ماضی کی پریشان صدا ہوں
نغموں میں سمویا ہے لہو اپنے جگر کا گیتوں کے بہانے یہ لہو تھوک رہا ہوں
کچھ لوگ یہ کہتے ہیں عطاء خود کو سنبھالو وہ دشمنِ جاں ہے، تو بھلا کیوں نہیں دیتے؟
جینے کی ہوس اتنی کہاں ہے، مرے دل میں ظالم مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

(۸)

ان اشعار میں "گیتوں کے بہانے یہ لہو تھوک رہا ہوں" کا استعارہ فنکار کے اس کربناک وجودی احساس کو عیاں کرتا ہے جہاں گانا ایک تفریح نہیں بلکہ اپنے ہی زخموں سے رسنے والے لہو کو نغمے کی شکل دے کر دنیا کے سامنے بہا دینے کا نام ہے۔ یہ صوتیاتی اور متنی امتزاج عطاء اللہ کے المیہ گیتوں کو تاریخ کا لافانی باب بناتا ہے۔ یہاں گلوکاری اور سوانح، سر اور لہو، لفظ اور زخم آپس میں مدغم ہو کر ایک ایسی فنکارانہ یکتائی پیدا کرتے ہیں جو سامع کو مسحور بھی کرتی ہے اور اس کے باطن کو جھنجھوڑ کر بھی رکھ دیتی ہے۔

۷۔ نمائندہ المیہ گیت نگار

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ فن کا تنقیدی جائزہ اس وقت تک نامکمل رہتا ہے جب تک کہ ان گمنام اور لوک نغمہ نگاروں کے کردار کا اعتراف نہ کیا جائے جنہوں نے اپنے جذبوں کی تپش سے ان گیتوں کے بول تخلیق کیے۔ دنیا کی موسیقی کی تاریخ بتاتی ہے کہ بڑی گائیکی ہمیشہ بڑے کلام کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ عطاء اللہ کو یہ تاریخی برتری حاصل رہی کہ انہیں ایسے شعرا کا ساتھ میسر آیا جو کتابی اور فرضی دنیا کے بجائے عام انسانوں کے کچے مکانوں، ویران گلیوں اور صحرائی بستیوں کے حقیقی باشندے تھے۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

عطاءاللہ نے ہمیشہ اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ ان کی کامیابی کا ایک بہت بڑا حصہ ان کے نغمہ نگاروں کے مرہونِ منت ہے، جنہوں نے عوامی دکھوں کو سادہ مگر پر تاثیر زبان میں ڈھالا۔

عطاءاللہ کے المیہ ذخیرے کی تخلیق میں کئی اہم شعرا نے حصہ لیا، جن میں سے ہر ایک کا اپنا ایک الگ اسلوب اور المیہ کینوس تھا۔ ان شعرا نے غزل، گیت، دوہڑے اور ماہیے کے روایتی اصناف کو عوامی دکھوں کے اظہار کے لیے کمال مہارت سے استعمال کیا۔ ذیل میں ان نمائندہ المیہ گیت نگاروں کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

(الف) ایس ایم صادق: سادگی، عوامی حزن اور براہِ راست شکوہ

شیخ محمد صادق المعروف ایس ایم صادق کا شمار پاکستان کے سب سے زیادہ مقبول اور عوام دوست گیت نگاروں میں ہوتا ہے۔ فیصل آباد کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے اس شاعر نے زندگی کے نشیب و فراز کو انتہائی قریب سے دیکھا۔ ان کی شاعری کا بنیادی اختصاص یہ ہے کہ وہ کسی بھی قسم کی پیچیدہ علامتی بھول بھلیوں، ثقیل عربی و فارسی تراکیب یا ادق فلسفے کا سہارا نہیں لیتے۔ ان کا کلام سڑک، گلی، کھیت اور ورکشاپ پر کام کرنے والے عام آدمی کی زبان میں براہِ راست وار کرتا ہے۔ ان کے ہاں لفظ تیر کی طرح سیدھے دل میں پیوست ہوتے ہیں۔

ایس ایم صادق کے المیہ گیتوں میں عاشق اپنے لٹ جانے کا نوحہ بغیر کسی بناوٹ کے سناتا ہے۔ وہ محبوب کی بے وفائی اور دنیا کی دغابازی کو ایک برہنہ سچ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں محبوب کوئی ماورائی مخلوق نہیں بلکہ اسی مادی دنیا کا ایک بے وفا انسان ہے جو اپنے مفاد کے لیے دل توڑ دیتا ہے۔ ان کا لافانی گیت اس اسلوبیاتی سادگی اور جذباتی شدت کا شاہکار ہے:

اچھا صلہ دیا تو نے میرے پیار کا
یار نے ہی لوٹ لیا گھر یار کا
(۱۰)

اس شعر کا متنی و نفسیاتی محاکمہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں خیانت کا صدمہ اس قدر شدید ہے کہ عاشق کسی استعارے کے پیچھے چھپنے کے بجائے سیدھا الزام عائد کرتا ہے۔ لفظ "یار" کا تکرار اور اسی کے ہاتھوں "گھر کے لوٹے جانے" کا المیہ اس منافقت اور دھوکے کو بے نقاب کرتا ہے جو انسانی رشتوں کا سب سے المناک المیہ ہے۔ ایس ایم صادق نے انسانی رشتوں کی شکست، دوست نما دشمنوں کے وار اور محبت میں ملنے والی تباہی کو جس بے باکی اور سادگی سے لکھا، اس نے عطاءاللہ کی آواز کے ساتھ مل کر کروڑوں سننے والوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔

عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> "میں نے جن غیر معروف شاعروں کا کلام گایا وہ آج دیوان ہیں۔ میں اپنے دوست شاعر ایس ایم صادق کا مشکور ہوں جنہوں نے ہمیشہ مجھے بڑے اچھے کلام سے نوازا اور میرے لئے انہوں نے بڑی عوامی بات لکھی جو لوگوں نے پسند کی اور اس طرح ان کا بھی نام ہوا اور مجھے بھی شہرت ملی۔"(۹)

یہ باہمی اشتراک اس بات کا ثبوت ہے کہ عیسیٰ خیلوی اور ان کے شعرا کے درمیان کوئی تجارتی یا رسمی معاہدہ نہیں تھا بلکہ وہ دونوں ایک ہی وسیب، ایک ہی مٹی اور ایک ہی المیہ احساس کے ترجمان تھے۔ شاعر اپنے قلم سے جو درد رقم کرتا تھا، گلوکار اپنے گلے کے سوز سے اس کی شدت کو ہزار گنا بڑھا کر عوام کے دلوں میں اتار دیتا تھا۔ یہ رشتہ محض ایک گلوکار اور نغمہ نگار کا نہیں تھا بلکہ دو دردمند روحوں کا وہ اشتراک تھا جس نے پنجاب اور سرائیکی لوک موسیقی کو نئے شعری اور جذباتی آدرش عطا کیے۔

(ب) فاروق روکھڑی: تھل کی جمالیات، تہذیبی وقار اور گہری اداسی

فاروق روکھڑی (مرحوم) کا مقام عطاءاللہ کے تمام گیت نگاروں میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ ان کے ہاں گیت نگاری ایک باقاعدہ ادبی، تہذیبی اور اعلیٰ جمالیاتی مرتبے پر فائز نظر آتی ہے۔ ان کا تعلق میانوالی کی زرخیز مٹی سے تھا اور ان کے کلام میں تھل کے صحراؤں کی پیاس، ریت کے بگولوں کی اداسی اور دیہی پنجاب کا روایتی حیا و وقار پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ فاروق روکھڑی نے سرائیکی شاعری کو وہ نزاکت، علامتی گہرائی اور کلاسیکی رچاؤ بخشا جو بہت کم شعرا کے حصے میں آیا۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

فاروق روکھڑی کے المیہ گیتوں کا سب سے بڑا اختصاص یہ ہے کہ وہ دکھ اور ہجر کے بیان میں بھی اپنے لہجے کی شائستگی اور تہذیبی خودداری کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ ان کا کلام سطحی شکوہ گری کے بجائے ایک گہرے اور پروقار المیے کا عکاس ہے۔ ان کے ہاں ہجر کی آگ میں جلنے والا کردار گلہ کرنے کے بجائے محبوب کی یادوں کے چراغ جلاتا ہے۔

ان کا لافانی گیت اس بات کا بین ثبوت ہے:

قمیض تیڈی کالی تے سوہنے پھلاں والی
تے نِت سانوں یاد آوے تیڈی پئی گل وچ پالی

(۱۱)

اس گیت کے متن کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ رنگ یہاں صرف لباس کا رنگ نہیں ہے بلکہ وہ ہجر کے سوگ، یادوں کی چادر اور محبوب کے چلے جانے کے بعد ویران ہو جانے والی زندگی کا ایک مکمل علامتی استعارہ ہے۔ "گل وچ پالی "(گلے میں پڑی ہوئی شال یا چادر) دیہی ثقافت کا وہ مانوس پیکر ہے جو بچھڑ جانے والے وجود کی خوشبو کو ہمیشہ کے لیے سینے میں محفوظ کر لیتا ہے۔ فاروق روکھڑی نے اپنے گیتوں میں تھل کے روایتی رہن سہن اور دیہی منظر نامے کو اس خوبصورتی سے پرویا کہ وہ سرائیکی المیہ ادب کا ایک درخشاں کلاسک بن گیا۔

(ج) سید قاسم شاہ: وجودی کرب اور حیات و ممات کا فلسفہ

سید قاسم شاہ کا المیہ کلام عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی گائیکی کو ایک ایسی فکری وسعت اور کائناتی گہرائی عطا کرتا ہے جہاں انسان کا دکھ محض کسی شخص کی بے رخی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ زندگی، موت، تقدیر اور ازلی محرومی کے فلسفیانہ سوالات سے جا ملتا ہے۔ قاسم شاہ کے ہاں عاشق ایک ایسا المیہ کردار ہے جس پر دنیا کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں اور جو زندگی کے عذاب کو سہتے سہتے موت کو ایک پناہ گاہ سمجھنے لگتا ہے۔ ان کی شاعری میں اردو کی کلاسیکی مرثیہ نگاری اور صوفیانہ فنائیت کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔

قاسم شاہ کا یہ کلام برصغیر کے مقبول ترین المیہ نغمات میں شمار ہوتا ہے:

عشق میں ہم تمہیں کیا بتائیں کس قدر چوٹ کھائے ہوئے ہیں
موت نے ہم کو مارا ہے اور ہم زندگی کے ستائے ہوئے ہیں

(۱۲)

اس کلام کا متنی تجزیہ واضح کرتا ہے کہ یہاں اردو غزل کے روایتی المیہ مضامین کو کتنی مہارت سے لوک دھن کے قالب میں سمویا گیا ہے۔ "موت نے ہم کو مارا ہے اور ہم زندگی کے ستائے ہوئے ہیں "کا تضاد انسان کے اس شدید وجودی کرب کو ظاہر کرتا ہے جہاں سانس لینا خود ایک مستقل اذیت بن جاتا ہے۔ یہاں موت دشمن نہیں رہتی بلکہ وہ زندگی کے مقابلے میں ایک پرسکون نجات دہندہ بن کر سامنے آتی ہے۔ قاسم شاہ نے المیے کو ایک تقدس اور اٹل سچائی کا درجہ دیا جس نے عطاء اللہ کی گائیکی کو صوفیانہ اور فلسفیانہ سنجیدگی عطا کی۔

(د) دیگر ہم عصر المیہ گیت نگار: ملک سونا خان بے وس، مظہر نیازی اور دیگر

ان تین بڑے ناموں کے علاوہ عطاء اللہ کی المیہ گائیکی کو سجانے میں ملک سونا خان بے وس، مظہر نیازی، بشیر احمد غمناک، میاں نذر حسین، اور یاسین باگوی جیسے مقامی قلم کاروں نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ ملک سونا خان بے وس کے دوہڑوں میں دیہی پنجاب کے غریب انسان کی بے بسی، مقدر کی ستم ظریفی اور جھوٹے سماجی وعدوں کا ایسا نوحہ ملتا ہے جو کلیجہ ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ان گمنام شعرا نے ثابت کیا کہ حقیقی شاعری کے لیے کسی بڑے شہر کے ادبی جریدے یا اکادمی کی سرپرستی ضروری نہیں، بلکہ دل کی سچی چوٹ ہی وہ واحد کسوٹی ہے جو کلام کو امر بنا دیتی ہے۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

المیہ گیتوں کے کثیر جہتی موضوعات: پردیس، سماجی جبر اور طبقاتی محرومی

عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ گیتوں کے موضوعاتی تنوع کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے گیتوں میں انسان کے دکھ کو کئی مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ ان کے نغمات روایتی گل و بلبل کے فرضی قصوں سے کوسوں دور ہیں۔ ان موضوعات میں سب سے نمایاں پہلو پردیس کا کرب، سماجی جبر اور خلوص کی ناقدری ہے۔

عطاءاللہ کے گیتوں میں پردیس کا موضوع معاشی جبر کے نتیجے میں جنم لینے والے اس درد کی عکاسی کرتا ہے جس نے لاکھوں دیہی نوجوانوں کو اپنے گھر بار، والدین اور محبت سے دور کر دیا۔ ستر اور اسی کی دہائیوں میں جب خلیجی ممالک میں مزدوروں کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا، تو دیہات کے دیہات اپنے محنتی نوجوانوں سے خالی ہو گئے۔ پیچھے رہ جانے والے بوڑھے والدین اور انتظار میں گھلنے والی محبوباؤں کا درد عطاء اللہ کے گیتوں کا مرکزی محور بن گیا۔ پردیسی کی واپسی کا انتظار اور اس کے راستے میں آنکھیں بچھانے والی محبوبہ کا المیہ پروفیسر منور علی ملک کی کتاب میں درج اس شعر سے عیاں ہوتا ہے:

تو کہتے تھے بہار آئی تو لوٹ آؤں گا
لوٹ آؤ میرے پردیسی بہار آئی ہے

(۱۳)

اس شعر میں بہار کی آمد اور محبوب کی عدم موجودگی کا تضاد المیے کی شدت کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ بہار جو تجدید، شادمانی اور زندگی کی علامت ہے، پردیسی کے نہ آنے پر ہجر کا ایک جان لیوا عذاب بن جاتی ہے۔ کائنات کا ہر کھلتا ہوا پھول اور ہر یالی عاشق کے دل میں ہجر کے کانٹے بن کر چبھنے لگتی ہے۔ عطاء اللہ نے مسافرت کے اس عذاب کو ایسی دردناک تانوں کے ساتھ گایا کہ پردیس میں مقیم مزدوروں کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

دیہی معاشرے کی سخت بندشیں، قبائلی رسوم، طبقاتی اونچ نیچ اور لوگوں کی بے جا مداخلتیں کس طرح دو پیار کرنے والوں کی زندگیاں برباد کر دیتی ہیں، اس کا نوحہ عطاء اللہ کے گائے ہوئے اس نغمے میں پوری شدت سے گونجتا ہے:

مار مکایا ظالم لوکاں
میں کیندے کیندے ہتھ روکاں
دل کردا اے چھوڑ کے تیرا شہر کتھے نس جاواں
دس کیڑے پاسے جاواں

(۱۴)

یہاں عاشق کا کرب اس سماجی جبر کے خلاف ایک بے بس چیخ بن جاتا ہے جہاں پورا معاشرہ اس کی محبت کا دشمن بن چکا ہے اور اس کے پاس اپنے ہی محبوب کے شہر کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں بچا۔ "میں کیندے کیندے ہتھ روکاں" کا فقرہ اس بے پناہ سماجی دباؤ اور ہجوم کی سفاکیت کو ظاہر کرتا ہے جہاں اکیلا انسان پورے معاشرے کی منافقت اور بدزبانی کے سامنے بے بس ہو کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

عطاءاللہ کے کلام کا ایک مستقل المیہ یہ ہے کہ عاشق کانٹوں پر چل کر، اپنے پاؤں لہولہان کر کے بھی محبوب کے در پر پہنچتا ہے، مگر محبوب اس کے اس خلوص اور قربانی کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ سرمایہ دارانہ اور مفاد پرستانہ نظام میں خلوص کی یہ بے قدری اور وفا کی ارزانی انسان کو شدید باطنی صدمے سے دوچار کرتی ہے۔ اس بے قدری کا شکوہ اس سرائیکی شعر میں دیکھیے:

کنڈیاں تے کر کے آئے ہیڈے کولوں پیروں وانڑیں
اگے تیڈی مرضی ڈھولن توں جانڑیں یا نہ جانڑیں

(۱۵)

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

اس شعر میں ننگے پاؤں کانٹوں پر چل کر آنے کی تمثیل عاشق کے بے پناہ خلوص اور انتہا درجے کی قربانی کو ظاہر کرتی ہے، جس کے بعد وہ نتیجہ محبوب کی مرضی پر چھوڑ کر اپنی بے بسی کا اعلان کر دیتا ہے۔ "پیروں واٹڑیں " (ننگے پاؤں) چلنا دراصل اپنی انا، آسائش اور وجود کو محبوب کی چوکھٹ پر قربان کر دینے کا وہ علامتی اظہار ہے جس کے بعد عاشق کے پاس کھونے کے لیے کچھ باقی نہیں بچتا۔

جب تمام رشتے ٹوٹ جائیں اور سماج کے بند راستے انسان پر تنگ ہو جائیں تو وہ بے سمتی اور حیرت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ زندگی ایک ایسا بیابان بن جاتی ہے جہاں کوئی سمت، کوئی منزل اور کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہتی۔ اس کیفیت کو عطاء اللہ کے اس مشہور لوک بول میں دیکھا جا سکتا ہے:

کملی دا ماہی وے دس کہڑے پاسے جاواں
اللہ ناں بھلاوے اتاں ماہی والی ٹور اے

(۱۶)

یہ نغمہ اس باطنی تنہائی کا مظہر ہے جہاں عاشق راستوں کی گمشدگی اور منزل کی نارسائی پر ماتم کناں ہے۔ "کملی "کا لفظ اس ذہنی انتشار اور جنون کو ظاہر کرتا ہے جہاں دنیا کی تمام عقلیں اور دانائیاں محبوب کے عشق میں ہیچ ثابت ہو چکی ہیں، اور انسان ایک پکار بن کر ویرانوں میں بھٹک رہا ہے۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ گیتوں نے پاکستانی سماج کے پسے ہوئے، محنت کش اور محروم طبقات کے لیے جو نفسیاتی کردار ادا کیا، وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ پسماندہ طبقات کے پاس اپنی روزمرہ کی جذباتی گھٹن، طبقاتی ناانصافیوں اور غربت کے ہاتھوں بکھر جانے والے سپنوں کا نوحہ سنانے کے لیے کوئی سیاسی یا سماجی پلیٹ فارم موجود نہیں تھا۔ دن بھر اینٹوں کے بھٹوں، فیکٹریوں کے شور، ٹرکوں کے طویل اور تھکا دینے والے سفر، اور کچہریوں کی ذلتوں سے گزرنے والا انسان شام کو جب عطاء اللہ کی کیسٹ سنتا تھا، تو اس کے آنسو اس کے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر دیتے تھے۔

عطاء اللہ کے المیہ گیتوں نے ایک اجتماعی اور عوامی سائیکو تھراپی کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان نغمات نے سامعین کو یہ احساس دلایا کہ ان کے آنسو، ان کے دکھ اور ان کی شکستیں تنہا ان کی نہیں ہیں بلکہ یہ پورے طبقے کا مشترکہ مقدر ہیں۔ ان گیتوں کے ذریعے اپنے اندر کا درد آنسوؤں کی صورت میں بہا کر کروڑوں محنت کشوں کو ایک نیا باطنی حوصلہ ملتا تھا جس کے سہارے وہ زندگی کی اگلی کٹھن صبح کا سامنا کرنے کے قابل ہوتے تھے۔ یوں یہ المیہ گائیکی محض مایوسی پھیلانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک زبردست نفسیاتی ڈھال اور سچا عوامی کیتھارسس بن کر سامنے آئی۔

حاصل بحث

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے المیہ گیت برصغیر کی روایتی لوک حزنیہ روایت اور کلاسیکی المیہ شعریات کا ایک نامیاتی اور ارتقائی تسلسل ہیں، جنہوں نے تھل کے جغرافیے اور صحرائی پیاس کو سرائیکی اور اردو کے لوک انگ میں ڈھال کر ایک باوقار عوامی اسلوب عطا کیا۔ ان نغمات کی تاریخ ساز مقبولیت میں جہاں عطاء اللہ کے گلے کے قدرتی سوز، کھردرے پن اور المیہ صوتیاتی ساخت کا دخل ہے، وہیں ان کے المیہ گیت نگاروں بالخصوص ایس ایم صادق، فاروق روکھڑی اور سید قاسم شاہ کا کردار بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے جنہوں نے عام بول چال، دیہی استعارات اور وجودی سوالات کو گیتوں کا حصہ بنایا۔ عطاء اللہ کے المیہ کلام کے موضوعات روایتی عشقیہ ناکامی سے کہیں بلند ہو کر پردیس کے کرب، معاشی ناہمواری، طبقاتی جبر، سماجی منافقت اور تقدیر کے سامنے انسان کی بے بسی جیسے گہرے سماجیاتی مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔ کیسٹ کلچر کی تکنیکی لہر نے نشریاتی اداروں کی اشرافیائی اجارہ داری کو توڑ کر ان المیہ نغمات کو عوام کے وسیع تر طبقے تک پہنچایا، جس نے محنت کشوں اور پردیسیوں کے لیے ایک ہمہ گیر اجتماعی نفسیاتی تزکیے (Mass Catharsis) کا کام کیا۔

یہ تحقیق اس امر کی متقاضی ہے کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اور ان کے گیت نگاروں کے شعری و موسیقائی سرمائے کو پاکستانی جامعات کی سطح پر ادبی اور سماجیاتی تحقیق کے مرکزی نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ لوک ثقافت اور عوامی حافظے کے اس عظیم اثاثے کی مستند علمی حفاظت ممکن ہو سکے۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

حوالہ جات

۱۔ ارسطو، فن شاعری (بوطیقا)، مترجم: عزیز احمد، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص: ۵۳

۲۔ منور علی ملک، پروفیسر، درد کا سفیر: عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، مرتب: علی عمران اعوان، تیسرا ایڈیشن، راولپنڈی: سٹوڈیو نمبر ۶، ۲۰۱۸ء، ص ۹۳

۳۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۔ ایضاً، ص ۳۴

۵۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، انٹرویو: مشفق راٹھور، اخبارِ جہاں، کراچی، ۱۶ تا ۲۲ مئی ۲۰۱۱ء، ص ۲

۶۔ ایضاً، ص ۱

۷۔ منور علی ملک، پروفیسر، درد کا سفیر: عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، مرتب: علی عمران اعوان، تیسرا ایڈیشن، راولپنڈی: سٹوڈیو نمبر ۶، ۲۰۱۸ء، ص ۱۶

۸۔ ایضاً، ص ۵۵

۹۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، انٹرویو: مشفق راٹھور، اخبارِ جہاں، کراچی، ۱۶ تا ۲۲ مئی ۲۰۱۱ء، ص ۲

۱۰۔ ایس ایم صادق، اچھا صلہ دیا تو نے، نغمہ مشمولہ آڈیو البم والیم ۱۷، گائیک: عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، فیصل آباد: رحمت گراموفون ہاؤس، ۱۹۸۵ء، آڈیو ٹریک

۱۱۔ فاروق روکھڑی، قمیض تیڈی کالی، نغمہ مشمولہ آڈیو البم والیم ۱۲، گائیک: عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، فیصل آباد: رحمت گراموفون ہاؤس، ۱۹۸۳ء، آڈیو ٹریک

۱۲۔ سید قاسم شاہ، عشق میں ہم تمہیں کیا بتائیں، نغمہ مشمولہ البم عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، لاہور: شالیمار ریکارڈنگ کمپنی، ۱۹۸۸ء، آڈیو ٹریک

۱۳۔ منور علی ملک، پروفیسر، درد کا سفیر: عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، مرتب: علی عمران اعوان، تیسرا ایڈیشن، راولپنڈی: سٹوڈیو نمبر ۶، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۰

۱۴۔ ایضاً ص ۵۲

۱۵۔ ایضاً ص ۱۳۴

۱۶۔ ایضاً ص ۵۲